دینی مدارس کے معاشرتی کردار کے حوالہ سے ایک مکالمہ

[ہماری خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی موضوع پر گفتگو ہو تو اس کے تمام اہم پہلو قارئین کے سامنے آ جائیں تاکہ انہیں رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔ گزشتہ دنوں ملک کے معروف کالم نگار اور دانش ور جناب عطاء الحق قاسمی نے دینی مدارس کے حوالے سے 'الشریعہ' کے رئیس التحریر مولانا زاہد الراشدی کی ایک تقریر کے اہم اقتباسات روزنامہ جنگ میں اپنے کالم 'روزن دیوار' میں شائع کیے تو اس پر بحث کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ اس سلسلہ کے مضامین اور خطوط کو یکجا طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جن کے آخر میں ان میں اٹھائے گئے اہم نکات پر مولانا زاہد الراشدی کا تبصرہ بھی شامل ہے۔ (مدیر)]

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

﴿عطاء الحق قاسمی﴾

ہمارے ذہنوں میں مولوی کا تصور وہی ہے جو آدھی رات کو مسجد کے چیختے چنگھاڑتے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے یا سیاسی مولویوں کی دو عملی ہمارے ذہنوں میں مولوی کا امیج مسخ کرنے کا باعث بنی ہے لیکن میں ''مولویوں'' میں اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ ان کے مثبت اور منفی پہلو دونوں میرے ذہن میں ہیں۔ وہ جو صحیح معنوں میں مولوی ہیں، ان کا وژن بہت وسیع ہے۔ مسٹر حضرات ان کی جہتوں سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ان کا طرز استدلال بڑے بڑے بزرجمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمارے مسٹر حضرات مولوی پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کرتے ہیں، وہاں وہ بہت عرصے سے مولوی کو مسلم امہ کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کا ذمہ دار بھی ٹھہراتے ہیں اور ہم لوگ ان کی بات پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں۔

مجھے گزشتہ روز ڈاک میں مولانا زاہد الراشدی کی شائع شدہ ایک تحریر ملی جو انہوں نے مدرسہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کی تھی۔ اس میں مولانا نے دیگر الزامات کے علاوہ اس الزام کا جواب بھی دیا ہے

جو مولوی حضرات پر مسلمانوں کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ مجھے مولانا کی بات میں وزن محسوس ہوا ہے اور یوں صورتحال

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

والی لگتی ہے۔ مولانا کی تقریر سے ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے:

''سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے آج ہم دنیا میں اپنے جائز مقام سے محروم ہیں اور ہمارے مصائب و آلام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ صرف ایک مثال سے بات سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے پون صدی یا ایک صدی قبل ہم مسلمانوں کو بہت بڑی دولت سے نوازا۔ خلیج میں تیل کی دولت دی۔ یہ ہمارا ادبار کا دور تھا، زوال کا دور تھا مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے وقت کی سب سے بڑی دولت عطا فرمائی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم تیل زمین سے نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے، چشمے کھودنے کی تکنیک سے بے بہرہ تھے، تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے ہم کورے تھے اور تیل کو ریفائن کرنے کے بعد دنیا کی مارکیٹ میں بیچنے کے لیے مارکیٹنگ کی صلاحیت بھی ہم میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے ہم مغربی ماہرین کو بلانے پر مجبور ہوئے۔ مغربی ماہرین آئے، پھر مغربی کمپنیاں آئیں، ان کے بعد بینک آئے، پھر سیاست کار آئے اور ان کے ساتھ مغرب کی فوجیں بھی آ گئیں جو آج تیل کے چشموں کا گھیراڈالے بیٹھی ہیں۔

ذرا خیال کیجیے کہ تیل ہمارا، چشمے ہمارے، کنویں ہمارے، زمین ہماری لیکن ان پر قبضہ کس کا ہے؟ اور کس وجہ سے ہے؟ یہ ہماری نااہلی تھی کہ ہم تیل نکالنے، صاف کرنے اور عالمی مارکیٹ میں اسے بیچنے کی صلاحیت سے محروم تھے جس کی وجہ سے مغرب سے ماہرین آئے اور آج ماہرین، کمپنیاں، بینک اور پھر فوجیں خلیج میں تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تیل نکالنے، صاف کرنے اور مارکیٹنگ کی صلاحیت آج بھی ہم میں موجود نہیں ہے اور مغرب کے ارادے یہ ہیں کہ ابھی امریکی وزارت دفاع پینٹاگون میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی احکامات کی من وعن تابع داری نہ کی تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لیا جائے گا اور مغربی ملکوں میں اس کے اثاثے اور مغربی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹس ضبط کر لیے جائیں گے۔

اس لیے ہمیں اس کی تکلیف زیادہ ہے اور ہم اس کا درد زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرنا چاہیے اور میں ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے، دعوت دیتا ہوں کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ امت کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟

میں تاریخ کے حوالے سے بات کروں گا۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کر دیا تھا، دینی مدارس ختم کر دیے تھے، نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا دیا تھا۔ دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ علماء

کرام نے قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے عوام سے تعاون کے لیے رجوع کیا، چندے مانگے، گھر گھر دستک دے کر روٹیاں مانگیں، زکوٰۃ وصدقہ کے لیے دست سوال دراز کیا اور سرکاری تعاون سے بے نیاز ہو کر عوامی تعاون کے ساتھ قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی تہذیب وثقافت کے آثار کو بچانے کے لیے کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی، سر پر چنگیر رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگیں، ہاں ہاں میں نے خود روٹیاں مانگی ہیں، اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے اپنی طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے کئی محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم نے اپنی عزت نفس کی پروا نہیں کی، طعنے سنے ہیں، بے عزتی برداشت کی ہے لیکن قرآن وسنت کی تعلیم کو باقی رکھا ہے جس کی گواہی آج دشمن بھی دے رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور طبقہ سامنے آیا جس نے قوم کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی، سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا، انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمے لی۔ انہیں اس کام کے لیے ریاستی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے قومی خزانے کے کھربوں روپے خرچ کر ڈالے۔ انہیں سرکاری وسائل میسر تھے، ریاستی پشت پناہی حاصل تھی لیکن وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری مولوی کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج کی اجتماعی دانش سے سوال کرتا ہوں کہ وہ انصاف سے کام لے اور یہ فیصلہ کرے کہ نااہل کون ثابت ہوا اور اپنی ذمہ داری کس نے پوری نہیں کی؟ آج اگر ملک کے کسی گوشے میں دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، قرآن وسنت کی راہ نمائی لوگوں کو میسر نہیں ہے اور اسلام کی آواز نہیں لگ رہی تو ہم مجرم ہیں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالیے۔ یہ ناانصافی ہے، اس کے بارے میں ان سے پوچھیے جنہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس کے لیے سرکاری خزانے کے کھربوں روپے اب تک انہوں نے خرچ کر ڈالے ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مساجد میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر ہیں؟ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قاری مل رہے ہیں؟ رمضان میں قرآن سنانے کے لیے حافظ مل جاتے ہیں؟ جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب موجود ہیں؟ مسئلہ بتانے والے مفتی صاحبان کی کمی تو نہیں؟ دینی راہ نمائی دینے کے لیے علماء کرام سے ملک کا کوئی گوشہ خالی تو نہیں؟ اس سے اگلی بات کہ میدان جنگ میں کفر کے خلاف صف آرا ہونے والے مجاہدین بھی ان مدارس سے آپ کو مل رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو دینی مدارس پر اعتراض کس بات کا ہے؟

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی آج ہی ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ انہوں نے وفاقی وزرا سے کہا کہ سرکاری نصاب تعلیم اور نظام کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قومی کمیشن قائم کیجیے اور ہمیں اور سرکاری تعلیم کے ذمہ داروں کو اس کے سامنے پیش کیجیے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا

پانی ہو جائے گا۔‘‘

(روزنامہ جنگ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۲ء)

مولانا زاہد الراشدی کے جواب میں!

﴿عطاء الحق قاسمی﴾

کسی بھی لکھاری کے لیے اس کے قارئین کے خطوط بہت اہم ہوتے ہیں۔ضروری نہیں کہ وہ کالم میں شائع بھی ہوں لیکن ان سے مسئلے کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔گزشتہ دنوں میرا ایک کالم ’’ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا جو دینی مدرسوں اور انگریزی تعلیم کے حوالے سے مولانا زاہد الراشدی کی ایک تقریر کے حوالے سے تھا۔ مجھے مولانا کی بات میں بہت وزن محسوس ہوا تھا چنانچہ میں نے ان کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ مجھے اس کالم پر پاکستان کے مختلف شہروں سے تائیدی ٹیلیفون موصول ہوئے تاہم ٹورنٹو (کینیڈا) سے ایک قاری انصر رضا نے مجھے اپنا موقف بذریعہ فیکس (042-7513234) ارسال کیا جو مولانا زاہد الراشدی کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ چونکہ انصر رضا صاحب نے بھی اپنی بات سلیقے سے اور دلیل سے کی ہے، سو ان کا موقف اور اس حوالے سے میری معروضات درج ذیل ہیں:

جناب عطاء الحق قاسمی صاحب

السلام علیکم

جناب زاہد الراشدی صاحب کے جس اقتباس میں آپ کو وزن محسوس ہو رہا ہے اور جس سے آپ بظاہر متاثر ہیں، وہ خود فریبی اور تاریخی حقائق کو مسخ کر کے بلکہ یکسر چھپا کر اپنی پاکی داماں کی حکایت کو بڑھانے کی ایک کوشش ہے۔اس میں ایک غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ انگریزوں نے دینی مدارس ختم کر دیے تھے۔ میں انگریزوں کا حامی نہیں ہوں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدرسہ دیوبند اور دارالعلوم ندوہ انگریزوں کے دور میں ان کی سرپرستی میں بنے۔ دارالعلوم ندوہ کا سنگ بنیاد یوپی کے لفٹیننٹ گورنر نے رکھا تھا لہٰذا انگریزوں پر یہ الزام کہ انہوں نے دینی مدارس ختم کر دیے تھے، نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی، بالکل غلط ہے۔کلکتہ اور دہلی کے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی علوم پر ریسرچ اور علما کو ’شمس العلما‘ کے خطابات سے ان کی عزت و توقیر بڑھانا اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزوں نے نظام تعلیم کو ترقی دی۔

دوسری بات یہ ہے کہ دینی اور دنیاوی علوم کی تقسیم اسلام میں کہاں جائز ہے کہ علما اس پر راضی ہو گئے کہ ہم صرف دینی علوم پڑھیں گے اور باقی لوگ دنیاوی علوم حاصل کریں؟ ماضی کے مشہور مسلمان مفکرین اور سائنس دان دونوں علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اقتدار کا مسئلہ ہو تو سیاست دین سے الگ نہیں ہو سکتی

لیکن علم سیکھنے کی بات ہو تو مشکل علوم کا بوجھ عامۃ الناس کے کندھے پر ڈال کر خود حلووں پر راضی ہو جائیں۔ جس دوسرے طبقے نے یہ نام نہاد ذمہ داری قبول کی تھی، ان کی راہ میں ان علما نے کتنے روڑے اٹکائے اور کفر کے فتووں سے کیسی کیسی گولہ باری کی، کون نہیں جانتا؟ مشہور ترین مثال سر سید احمد خان کی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کی ٹھانی اور بدترین ظلم کا نشانہ بنے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ علمائے دین کا بنیادی کام نیکی کی دعوت اور برائی سے بچنے کی تلقین کرنا ہے۔ انہیں نوید اور وعید دونوں سنانا ہیں لیکن ہوا یہ کہ وہ لوگوں پر صرف آگ برسانے لگے۔ اگر آپ ان کے عقائد اور قرآن وسنت کی من مانی تشریح سے متفق ہیں تو آپ پکے مومن ہیں، چاہے آپ رشوت خور ہوں، ذخیرہ اندوز ہوں، مزارعوں اور ماتحتوں پر ظلم کرنے والے ہوں، دھاندلی اور دھونس سے الیکشن جیتنے والے ہوں۔ لیکن اگر آپ ان کے مفہوم دین سے متفق نہیں تو آپ قطعی طور پر زندیق اور فاسق ہیں، چاہے آپ پنج وقتہ نمازی ہوں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حتی الوسع خیال رکھتے ہوں۔ قول وفعل کے اس تضاد اور اقتدار کی ہوس نے عوام کو ان علما سے متنفر کر دیا اور یوں ایسی مسلمان امت وجود میں آئی جسے خدا ہی ملا نہ وصال صنم، نہ وہ دین کی رہی اور نہ دنیا کی۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری علمائے دین پر ہے جنہوں نے ایک طرف تو عوام کی اصلاح وتربیت سے منہ موڑ لیا اور قرآنی معارف سے نہ خود آگاہ ہوئے نہ دوسروں کو اس کا شوق دلایا اور دوسری طرف دنیاوی علوم کو بیکار کہہ کر حوصلہ شکنی کی۔

والسلام۔ انصر رضا، ٹورنٹو، کینیڈا

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایک انگریز گورنر نے دار العلوم ندوہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا لہٰذا ثابت ہوا کہ انگریز دینی تعلیم کے پروموٹر تھے تو یہ بات حقائق سے لگا نہیں کھاتی۔ آج اگر صدر بش واشنگٹن کے اسلامی مرکز میں جوتے اتار کر اندر داخل ہوتے ہیں اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سادہ لوحی ہوگی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔ اسی طرح انصر رضا صاحب نے مشرقی علوم کے اداروں کی سرپرستی کے حوالے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ بھی محل نظر ہیں۔ سمجھدار محکوم قوم کی نفسیات سے مکمل آگاہی اور یوں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے ایسے ادارے قائم کیا ہی کرتے ہیں۔ یہ ادارے مقامی زبانوں پر دسترس حاصل کرنے کے لیے بھی قائم کیے جاتے ہیں چنانچہ امریکہ میں بھی ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ سرپرستی میں اس نوع کے ادارے قائم ہیں اور اس نوع کے ایک ادارے کے نصاب میں راقم الحروف کی تصنیفات بھی شامل ہیں۔ نیز جن علما کو شمس العلما وغیرہ کے خطابات دیے گئے، وہ دینی تعلیم کے حوالے سے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک ''شمس العلماء'' (مولانا محمد حسین آزاد) ایک اسلامی ملک میں باقاعدہ انگریزوں کے جاسوس تھے۔

البتہ دینی تعلیم اور انگریزی تعلیم کے حوالے سے انصر رضا صاحب نے جو دوسرے نکات اٹھائے ہیں، وہ واقعی قابل توجہ ہیں۔ ان کا جواب مولانا زاہد الراشدی پر واجب ہے۔ یہ جواب اگر اتنا ہی مختصر ہوا جتنا انصر رضا صاحب کا خط

ہے تو ان شاء اللہ انہی کالموں میں شائع ہوگا!

(روزنامہ جنگ، ۶ جنوری ۲۰۰۳ء)

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

﴿عطاء الحق قاسمی﴾

میرے ایک کالم میں دینی مدارس کے حوالے سے مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب کا نقطہ نظر شائع ہوا تھا اور اس کے بعد ایک قاری انصر رضا صاحب کا ایک تنقیدی خط بھی کالم میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد اس موضوع کی حمایت اور مخالفت میں بے شمار خطوط موصول ہوئے اور ظاہر ہے ان سب کی اشاعت ممکن نہ تھی چنانچہ میں نے یہ سلسلہ وہیں روک دیا۔ قاری کے تنقیدی خط کا جواب مولانا زاہد الراشدی نے دفتر کے پتہ پر ارسال کیا جو مجھے نہ مل سکا۔ اب انہوں نے دوبارہ یہ زحمت کی ہے جس کی وجہ سے یہ خط تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی موقف یہ ہے کہ دینی تعلیم دینے والے اور دنیاوی تعلیم دینے والے دونوں طبقے صرف ''ضروری صورت'' کے عالم اور دانشور پیدا کر سکے ہیں۔ دینی مدرسوں سے کوئی رازیؒ اور کوئی غزالیؒ ابھر کر سامنے نہیں آیا اور دنیاوی مدرسے ہمیں کوئی آئن سٹائن، کوئی نیوٹن نہیں دے سکے۔ دونوں نے بس ''غریبی دعوے'' والا کام کیا ہے۔ باقی رہی تنگ نظری کی بات، تو اپنے رویوں کے حوالے سے ''ملاّ'' دونوں طرف موجود ہیں۔ ایک طرف دین کے نام پر شٹل کاک برقعے کو لازمی قرار دینے والے بھی ہمارے درمیان ہیں اور دوسری طرف سیکولرازم اور روشن خیالی کے نام پر ترکی میں خواتین کے سکارف اوڑھنے پر بھی پابندی۔ یعنی ''تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا'' والی صورتحال ہے۔ بہرحال مولانا راشدی کا خط ملاحظہ فرمائیں:

''برادر محترم عطاء الحق قاسمی صاحب

آپ کے کالم میں محترم انصر رضا آف ٹورنٹو کا خط پڑھا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمارا نقطہ نظر جنگ کے ذریعہ ایک وسیع دائرے تک پہنچایا اور انصر رضا صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس پر ناقدانہ نظر ڈال کر بہت سے قارئین کو میری معروضات دوبارہ پڑھنے اور مجھے کچھ مزید باتوں کی وضاحت کا موقع فراہم کیا۔

انگریزوں کی طرف سے دینی مدارس کی سرپرستی کے حوالہ سے آپ کا موقف درست ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جارج ڈبلیو بش صرف جوتے اتار کر مساجد میں نہیں جا رہے بلکہ اخباری رپورٹوں کے مطابق امریکی حکومت نے پاکستان کے دینی مدارس کی ترقی، تعمیر اور اصلاح کے لیے ایک خطیر رقم بھی مختص کر رکھی ہے اور اس رقم کا مصرف مہیا کرنے کے لیے ہوم ورک جاری ہے۔ اسے اگر انصر رضا صاحب دینی تعلیم کی

سرپرستی سمجھتے ہیں تو انہیں مبارک ہو۔ ہم دینی مدارس والے اس مہربانی کے متحمل نہیں ہیں۔

جہاں تک دیوبند کے مدرسہ کی انگریزوں کی طرف سے سرپرستی کا سوال ہے، ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں دیوبند کے مدرسے اور مکتب فکر کا تاریخی استعمار دشمن کردار اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے اور کسی منصف مزاج شخص کے لیے اس سے زیادہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ انصر رضا صاحب کی خدمت میں یہ سوال ضرور پیش کرنا چاہوں گا کہ اگر ان کے بقول انگریزوں نے دینی مدارس کو ختم کرنے اور ان کے نظام کو تلپٹ کر دینے کے بجائے ان کی سرپرستی کی تھی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے جو تعلیمی نظام اور نصاب پورے برصغیر میں رائج کیا تھا، اسے ختم کر کے اس کی جگہ نئے تعلیمی نظام کو کس نے نافذ کیا تھا؟ اگر انصر رضا صاحب نظام تعلیم کی اس تبدیلی کے محرکات اور اہم مراحل سے آگاہ کر سکیں تو ان کا ہم پر بہت کرم ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی مدارس نے صرف دینی تعلیم پر اکتفا کیوں کیا اور دینی علوم اور دنیاوی علوم کی تقسیم کیوں کی تھی، اس کے بارے میں عرض ہے کہ دینی علوم کے وارثین نے کبھی دین و دنیا کی تقسیم نہیں کی اور نہ ہی وہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ ہاں اس دور کے معروضی حالات میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے غریبی دعوے کے ساتھ اتنا کام ہی کر سکتے ہیں اور وہ انہوں نے بحمد اللہ پورا کر دکھایا۔ یہ تقسیم علوم کا نہیں بلکہ تقسیم کار کا مسئلہ ہے اور اگر غصہ تھوک کر میری گزشتہ کالم کی معروضات پر سنجیدگی سے ایک نظر پھر ڈال لیں تو مجھے یقین ہے کہ خود انصر رضا صاحب محترم کے ذہن میں بھی یہ اشکال باقی نہیں رہے گا۔

انصر رضا صاحب نے سرسید احمد خان مرحوم کے کام میں رکاوٹ ڈالنے اور ان کی دینی تعبیرات کی مخالفت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری استدعا ہے کہ سرسید احمد خان مرحوم نے قرآن وسنت کی جس نئی تعبیر وتشریح کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کی صرف علما نے مخالفت نہیں کی بلکہ انہیں خود سرسید مرحوم کے رفقا مولانا الطاف حسین حالی مرحوم، شبلی نعمانی مرحوم اور ان کے دیگر معاصرین مثلاً اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی قبول نہیں کیا تھا اور ان تعبیرات وتشریحات سے کھلے بندوں براءت کا اظہار ضروری سمجھا تھا اور اس سے بڑھ کر سرسید احمد خان مرحوم کے شاگردوں میں سے بھی کسی نے دین کی اس تعبیر وتشریح کو اختیار نہیں کیا تھا۔ اگر سرسید احمد خان مرحوم کے کسی ساتھی یا شاگرد کا نام انصر رضا صاحب کو معلوم ہو کہ اس نے سرسید احمد خان کی دینی تعبیرات کو اختیار کیا تھا اور انہیں آگے بڑھانے میں دلچسپی لی تھی تو وہ اس کی نشاندہی فرما دیں۔ میں اس پر ان کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سرسید کی مخالفت کے الزام کا نزلہ عضو ضعیف مولوی پر ہی کیوں گرتا ہے اور ان تعبیرات کو رد کر دینے والے دیگر حضرات انصر رضا صاحب جیسے دوستوں کو کیوں یاد نہیں رہتے؟

اس سلسلے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ علمائے کرام نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ یہ بات بھی قطعی بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا دور ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا ہے اور ان کے فتاویٰ عزیزی میں آج بھی یہ فتویٰ موجود ہے جس میں انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قرار دیا تھا جبکہ مولانا